دور حاضر میں مذہبی انتہاپسندی کا رجحان اور اس کا خاتمہ تعلیماتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

ڈاکٹر عامر حنیف راجہ*

صہیب سلطان **

The article discusses how religion has been used in escalating extremism among people. People of one religion fight with people of other religion, then they argue among themselves and create different sects. It has been a tool in conquering territories and enslaving people. Religion has an emotional grip over people that they squeeze the right to survive of a person who disagree with them in matters of religious believes.

Holy Prophet (PBUH) teachings forbade Muslims from taking extreme action. His teaching emphasis is always on mercy, forgiveness and peace and tranquility in society. Islam inculcate in its followers to have staunch adherence to Islamic tenets, "do not interfere with others believes and do not leave the path that one follows".

Quran stressed that Allah had made religion easy to follow by its believers but man's rigid thinking has made it difficult. Muslims must read and try to understand Quran, it teaches people to be compassionate, merciful, kind, gracious and above all humane.

Holy Prophet (PBUH) forewarned Muslims not to worship personalities because it will destroy them. Muslims were emotional about Holy Prophet (PBUH) and described him as super-natural. Hazrat Muhammad(PBUH) checked them and repeatedly told them that he is

---

* اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ اصغر مال کالج راولپنڈی۔

** ریسرچ سکالر، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔

human being like any one of them and he is Allah's messenger.

Islam is against extremism of any kind. In Quran Surah Annam (Animal) verse 108: Allah says "Do not revile the idols which they invoke besides Allah, lest in their ignorance they should spitefully revile Allah".

Quran narrates to us about other religions; Muslims should study Quran, understand other religions and have balance approach towards others.

علوم و فنون کی بیش بہا ترقی نے انسان کے مختلف چیزوں کے بارے میں رویوں کو بہت متاثر کیا ہے۔خاص طور پر معاشرتی علوم میں بے انتہا غوروخوض نے انسانی رویوں کے کسی ایک جہت میں پہنچنے کے عمل کو انتہائی پیچیدہ بنادیا ہے۔ معاملہ تاریخ، سیاسیات اور قانون وغیرہ تک محدود ہوتا تو شاید کوئی خاص سنگین صورت حال جنم نہ لیتی کیونکہ یہ وہ علوم ہیں جن سے ہم روز مرہ کے معاملات کو طے کرتے ہیں اور یہ ایسی چیزیں ہیں جو کسی ملک یا قوم کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم مہیا کرتی ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر علم کے پیچھے اس کا فلسفہ اور اس سے متعلق انسانی نفسیات ایسے پوشیدہ حقائق ہیں جن کا معاملہ کسی دو آدمیوں کے متعلق بھی یکساں ہونا محال ہے۔ اس سلسلہ میں کسی بھی انسان کا ماحول، خاص طور پر اس کے رویوں کی شکل پذیری میں بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ چونکہ بنی نوعِ انسان کے ماحول میں یکسانیت مفقود ہے لہٰذ اعقائد اور تصورات کا مختلف فیہ ہونا ایک فطری امر ہے۔ اور انسانی رویوں میں انتہا پسندی ہی ایسا مظہر ہے جو معاملات کے اختلاف کو تصادم کی شکل دیتاہے، جس کا عملی اور فکری دونوں میدانوں میں مشاہدہ کیا جاسکتاہے۔ مسئلہ کے اس بیان کا تفصیلی جائزہ مقصود ہے۔ اس حوالے سے تعلیماتِ اسلامیہ اس کا کیا حل پیش کرتی ہیں، آیئے دیکھتے ہیں۔

انسانی رویوں میں انتہا پسندی کا دائرہ عمل

انتہا پسندی (Extremism)نام ہے احساسات، معاملات، نظریات ، شخصیات یا اثرات میں اعتدال کی راہ سے ہٹ کرکسی ایک انتہا کو اختیار کرلینے کا اور اس سے بہتر کسی قسم کے امکان یا وقوع کوتسلیم نہ کرنے کا۔[1] البتہ کسی ٹھوس بنیا د پر بہتری کے صرف امکان کوتسلیم نہ کرنے کا معاملہ مختلف نوعیت کا ہے۔ انتہا پسندی کا دائرہ عمل انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں تک محیط ہے ؛ سیاست، مذہب، معاشرت الغرض زندگی کے تمام معاملات میں ہم انتہا پسندی کا مختلف صورتوں میں مشاہدہ کرسکتے ہیں۔

اس کی بنیادوں کو تین اہم فکروں میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک فکر انسان کے ملکیتی جذبے سے متعلق ہے ، یعنی دنیا کا جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام۔ انسان اپنی ملکیتی زمین اور کارخانہ وغیر ہ سے وابستہ لوگوں کو اپنی مرضی کا پابند بنانے پر مصرہوتاہے جس کے پیشِ نظر اپنے مفادات کا تحفظ ہوتا ہے۔ انسانی معاشرے میں اس جذبہ کی کارفرمائی کی حدیں بڑی مضبوط بنیادوں پر قائم ہیں اور اشخاص اپنی ملکیت میں شراکت کو برداشت کرنے سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ ملکیت چند روپوں کی ہو یا کسی بڑی فیکٹری کی، سب کو یہ سوچ دامن گیر ہوتی ہے۔ دوسری فکر نسلی تفاخر سے متعلق ہے، ذاتوں اور قبیلوں کا ایک دوسرے پر برتری جتانااور پہلی فکر کی طرح یہ بھی معاشرے کے تمام طبقات میں پائی جاتی ہے۔ اور تیسری فکرانسان کی روحانیت سے متعلق ہے یعنی مذہب۔ جب انسان اپنی پہچان کسی خاص عقیدہ (Dogma) سے وابستہ کر دیتا ہے تو اس سے وابستہ رہنا اور دوسروں کو اس سے وابستہ کرنا اس کی بہت بڑی خواہش بن جاتی ہے اور اس سلسلہ میں وہ دوسروں کے عقائد ونظریات کو ذرہ بھر بھی برداشت کرنے کو تیارنہیں ہوتا۔ باقی دوفکروں کی طرح یہ بھی معاشرے کے تمام طبقوں کے لئے یکساں ہے۔آخری دوفکروں سے شخصیت پرستی جنم لیتی ہے جو معاشرے کے کم حیثیت اور بےعمل لوگوں کا بہت بڑا سہارا ثابت ہوتی ہے۔[۲] یہ تینوں فکریں مل کر سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے راہ ہموار کرتی ہیں اور اس طرح دنیا کی مختلف قومیتیں ملکیتی اور مذہبی استحقاق کو بنیا د بنا کر ایک دوسرے سے دست و گریبان نظر آتی ہیں۔مختصر یہ کہ انتہا پسندی کا دائرہ عمل زندگی کے تمام پہلوؤں اور معاشرے کے تمام طبقوں پر محیط ہے۔

ذرا سا بیان بنیاد پرستی کے متعلق غیر مفید نہ ہوگا۔کسی نظام کے پیروؤں کے ان روایات سے تمسک کو، جو اس نظام کے ساتھ پروان چڑھی ہوں، بنیاد پرستی قرار دیا جاسکتاہے۔گو اصطلاحاً بنیاد پرستی کو مذہبی اصولوں کی شدت کے ساتھ پیروی سے تعبیر کیا جاتاہے[۳] لیکن فکر میں بنیاد پرستی کا دائرہ ہرقسم کی روایات تک وسیع نظر آتاہے۔ لہٰذ ا احکامات کے معاملے کو روایات کی پیروی سے خلط نہیں کرنا چاہئے۔[۴] روایات سے یہ تمسک جدید نظریات کی قبولیت میں مانع ہوتا ہے کیونکہ ان روایات کو حد فاصل کا درجہ دے دیا جاتاہے۔ اس طرح سے بنیا د پرستی، انتہا پسندی کا ایک مظہر قرار پاتی ہے لیکن یہ موخر الذکر کے مقابلہ میں ایک محدو د جذبہ ہے۔

انسانی رویوں میں مذہب کا دائرہ عمل

مذہب انسان کی روحانی تربیت کا سامان پیدا کرتا ہے، اس لئے کہ وہ اپنے روز مرہ کے معاملات میں اعتدال اور خوبی کی راہ کو اپنائے تاکہ اس کے ہاتھ سے کسی دوسرے کا استحصال نہ ہوسکے اور معاشرے میں امن اور سکون قائم رہے۔اس لحاظ سے انسانی زندگی پر مذہب کا دائرہ عمل بھی بہت وسیع ہے لیکن صرف فکری حوالے سے کیونکہ ہر شخص یہ دعویٰ تو ضرور کرتا ہے کہ وہ فلاں مذہب کا پیروکار ہے لیکن جہالت یا ہٹ دھرمی کے باعث، عملی طور پر وہ اس دعویٰ سے تہی دامن نظر آتا ہے۔ اگر وہ اپنے اس دعویٰ کا کچھ پاس رکھتا بھی ہو تو پھر بھی اس کا عمل چند عبادات سے بمشکل ہی آگر بڑھ پاتا ہے۔ تقریباً ہر دور میں معاشرے کی اکثریت ہمیں اسی چیز کا شکار نظر آتی ہے جو کہ مذہب کا مقصود نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب معاشرتی زندگی کے احکامات میں معاشرے کے استحقاقی گروہ کے مفادات کی ضمانت فراہم نہیں کرتا، لہٰذا معاشرے کے استحقاقی گروہ اپنے وجود کو خطرہ محسوس کرتے ہوئے مختلف حیلوں اور تاویلوں سے مذہب کی عملی شکل کو نمودار ہونے سے روکے رکھتے ہیں اور عوام کا بہر حال انہی گروہوں سے معاشرتی تمسک بقا کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ کیونکہ ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کہ عوام کو ایسے بے لوث اور مدبر رہنما میسر آسکیں جو معاشرے کے استحقاقی گروہوں سے نبرد آزما ہوسکیں۔ بفرضِ محال ایسا ہو بھی جائے تو خود عوام کا شخصیت پرستانہ رویہ اصلاح کے عمل میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔[۵] گو اسلام کے متعلق ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ اس کی تعلیمات قیامت تک کے لئے راہِ ہدایت ہیں لیکن اپنی حقیقی روح کے ساتھ اسلام کی عملی شکل کا مظاہرہ ہمیں صرف خیر القرون کے مختصر سے دور میں ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس سے قبل اور بعد ازاں اب تک مذہب، مسلم معاشرے کی غالب اکثریت کے بیشتر معاملات میں، اپنی عملی شکل میں مفقود نظر آتا ہے۔

مذہب اور انتہاپسندی

مذہب کے نام کو مفادات کے حصول کے لئے استعمال کرنا بلاوجہ نہیں بلکہ مذہبی انتہا پسندی کے اسباب بذاتِ خود مذہب کے اندر سے بھی برآمد ہوتے ہیں، جسے ہم مذہب کی معنوی تحریف کا نتیجہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کسی بھی مذہب کا حقیقی پیغام چند نسلوں تک ہی محدود نظر آیا ہے۔ اس کے بعد اس پیغام کی تبلیغ پر چند لوگوں کا استحقاق قائم ہوجاتا ہے اور وہ اس

کی تشریح و تفسیر کے ذمہ دار تسلیم کرلئے جاتے ہیں جبکہ معاشرے کی اکثریت اپنے عمل میں اس استحقاقی گروہ کی تقلید اختیار کرلیتی ہے۔ جب یہ تقلید ایک لمبے عرصہ تک کسی معاشرہ میں کارفرما رہتی ہے تو مذہب، رسم و رواج کا مجموعہ نظر آنے لگتا ہے جس میں خود ساختہ رسومات بھی آسانی سے راہ پالیتی ہیں اور انہیں بھی مذہب کا حصہ تصور کیا جانے لگتا ہے۔ ان لگے بندھے اصولوں کی پیروی معاشرے کے غالب طبقے کے بہترین مفاد میں ہوتی ہے اس لئے وہ اس رواجی نظام کے خلاف کسی قسم کی مزاحمت کو پسند نہیں کرتے اور یہی رویہ مذہبی انتہا پسندی کے مظہر کے طور پر سامنے آتا ہے۔

ایسا تو ہرگز نہیں کہ کسی مذہب کی اصل تعلیمات انتہا پسندی کا درس دیتی ہوں بلکہ ہر مذہب اکثر و بیشتر رواداری اور اعتدال کی راہ سجھاتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی تاریخ میں انتہا پسندی کی سب سے مضبوط بنیا د مذہب ہی ٹھہرا۔سادہ لفظوں میں یہ کہہ لیں کہ مذہب کی آڑ میں انتہا پسندی کے رویوں کو پھلنے پھولنے میں کافی مدد ملی۔کسی علاقہ پر قبضہ کو آسان بنانے کا سب سے موثر حربہ یہی نظر آتا ہے کہ وہاں کے مخالف مذہب لوگوں کو نشانہ بنایا جائے، ہرممکن طریقے سے ان کی افرادی قوت کو کم کیا جائے اور وہاں اپنے ہم مذہب لوگوں کو بسایا جائے۔[۶] حالانکہ مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان نمایاں فرق عقائد اور عبادات کا ہوتا ہے جبکہ ان کے روز مرہ کے معمولات تقریباً ایک ہی ڈگر پر چل رہے ہوتے ہیں۔ اسلام کی ابتدائی ڈیڑھ دو صدیوں کو بڑی حد تک اس تجزیہ سے مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہے اور اس کے بعد سے تو مسلمان بھی اسی شمار میں آتے ہیں اور گذشتہ دو صدیوں کا معاملہ تو بدترین صورتِ حال میں شمار ہوتا ہے۔

مذہبی انتہا پسندی کے حوالے سے نکتہ جو ہم واضح کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ باوجود اس امر کے کہ مختلف مذاہب کے لوگ اپنے اعمال میں یکساں نظر آتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے لڑنے کے لئے وہ اکثر و بیشتر مذہب کو ہی بیچ میں لے کر آتے ہیں۔ اس افتراق کو کم کرنے کے لئے یورپ نے بظاہر مذہب کو چھوڑ کر قومیت (Nationalism) کو قوموں کی پہچان بنایا، جو کہ انتہا پسندی کا ہی ایک مظہر ہے، لیکن مذہبی انتہا پسندی سے وہ پھر بھی اپنا دامن نہ چھڑا سکے۔ مشرقی تیمور میں، جغرافیہ ایک ہونے کے باوجود، عیسائی ریاست کا قیام اس بات کا ایک بین ثبوت ہے۔ علاوہ ازیں سیکولرزم کا دعویدار امریکہ جب 'دہشت گردی' کے خلاف جنگ کا آغاز کرتا ہے تو اس کا صدر بے اختیار اپنے

بیان میں ہزار سال پرانی صلیبی جنگوں (کروسیڈز) کا ذکر چھیڑ بیٹھتا ہے۔۷

اس مسئلہ کی نفسیا ت یہ ہے کہ اپنے سیاسی مفادات کی جنگ پر جب کوئی مذہب کا لیبل لگا لیتا ہے تو وہ اپنے ہم مذہبوں کی زیادہ سے زیادہ حمائت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتاہے کیونکہ عوام کو مذہبی جوش بہت جلد چڑھ جاتاہے اور جب انہیں ہوش آتا ہے تو خواص اپنا کام کر چکے ہوتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں سکھوں کی انتہا پسندی کا محرک یہی کچھ تھا۔

مذہبی انتہا پسندی اور اسلامی روایات

اسلام کا معاملہ اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس کا کوئی کلیسا نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اسلام نے تحصیلِ علم کو ہرکس و ناکس کے لئے ضروری قرار دیا ہے ۸ تا کہ کو ئی استحقاقی گروہ انہیں کسی انتہا کی طرف ہانک کر نہ لے جاسکے۔ قرآن کو بار بار پڑھنے کی تاکید میں بھی یہی حکمت مضمر ہے۔ ایسا ہرگزنہیں کہ اسلامی معاشرے کے ہر فرد کو قرآن و حدیث کا عالم ہونا چاہیے بلکہ امر یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے اسلوب سے اس حد تک واقفیت ہو کہ خود ساختہ تعلیمات یا عقائد کی بنا پر گمراہی بعید از امکان ہوجائے۔

اسی بحث کو ہم اب قرآن و حدیث کے حوالے سے سمجھتے ہیں۔ اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں غوروخوض کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ قرآن کو بار بار پڑھتے رہنے کی ایک بڑی مصلحت یہ بھی ہے کہ اس پر غوروخوض جاری رکھا جائے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس میں بے شمار امکانات ہیں جس سے انسان علمی مسائل اخذ کرسکتاہے۔ جیسا کہ بیان ہوا:

ولقد صرفنا فی ھذا القران للناس من کل مثل ط وکان الانسان اکثر شیءٍ جدلاًط (الکھف۔ ۵۴)

ہم نے اِس قرآن میں ہر ہر طریقے سے تمام کی تمام مثالیں لوگوں کے لیے بیان کر دی ہیں لیکن انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔

مذکورہ آیت کے ذریعے اللہ تعالٰی نے بڑے لطیف پیرائیہ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تعلیمات الٰہیہ میں اتنی وسعت ہے کہ اس سے ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لئے سفارشات کو اخذ کیا جاسکتاہے، اور اس طرح اس رویے کی مذمت کی گئی ہے جس کے زیر اثر افراد کسی رائے کے وقوع

سے اس قدر تمسک اختیار کرلیتے ہیں کہ اس سے بہتر رائے کے نہ صرف امکان کو رد کردیا جاتا ہے بلکہ ایسی امکانی رائے کے وقوع پر اس کی مخالفت بھی کی جاتی ہے۔ اوراسی باعث انسان کو جھگڑالو قرار دیا گیا اور وہ اکثر چیزوں میں جھگڑا کرتا نظر آتا ہے اور جھگڑالوپن انتہاپسندی کا ہی ایک مظہرہے۔

لیکن یہ مسئلہ کی ایک سادہ صورت ہے۔ قرآن غوروفکر اور حصولِ علم کی ترغیب سے متعلق آیات سے پُر ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر واضح تعلیمات کے باوجود مسلمان انتہا پسندی کی طرف کس طرح راغب ہوگئے اور کیونکر ان میں گروہ در گروہ ہونے کے رجحان نے جڑ پکڑ لی۔اس کی ایک ممکنہ توجیہہ یہ ہوسکتی ہے کہ مسلمانو ں میں آغاز تا آخر کسی علمی تحریک کے بجائے سیاسی اور مذہبی تحریکوں کا عنصر کارفرما رہا ہے۔ پور ی اسلامی تاریخ میں علمی کا م یا تو علما ء کی ذاتی کاوش کا نتیجہ رہاہے یا کسی حکمران کی ا س دلچسپی کا، جو سیاسی بکھیڑوں سے فرصت پر ظہور پذیر ہوا کرتی تھی۔**۹** نیتجتاً ہمیں اسلامی تاریخ کے افق پر علمی شخصیات کی نسبت سیاسی شخصیات زیادہ واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ اور فرقہ پرستی، جو کہ انتہا پسندی کا ایک مظہر ہے ، سیاسی اور مذہبی تحریکوں**۱۰** سے پروان چڑھتی ہے جبکہ علم فرقہ پرستی کی بیخ کنی میں مدد و معاون ثابت ہوتاہے۔

اس سلسلہ میں ایک مثال زید بن علی بن الحسینؒ کی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ جیسے مجتھد کا ان کے بارے میں نظریہ ہے کہ'' میں نے ان کے زمانہ میں ان سے بڑھ کر فقیہہ اور حاضر جواب آدمی کوئی نہیں دیکھا ''۔**۱۱** روض الکبیر کے نام سے ایک فقہ ان سے منسوب ہے جو علمیت میں دوسری فقہوں سے واضح طور پر لگا کھاتی ہے۔**۱۲** لیکن آج ان کے نام کا زندہ ہونا ان کے علم وفضل کی بجائے ان کی حکومتِ وقت سے اس کشمکش کا رہین منت ہے جس میں وہ شہید ہوگئے۔**۱۳**

یہ ایک مثال ہے جبکہ ماضی بعید یا ماضی قریب میں احیا کی تما م تحریکوں کے پیش نظر کوئی علمی نصب العین نہیں ہے، جبکہ ان کا سیاسی نصب العین حالات میں کسی قسم کی کوئی بہتری پیدا نہ کرسکا۔ اگر ان تحریکات کا ایک حصہ علمی کاموں کے لئے مختص ہوتا تو اصلاح کی کوئی نہ کوئی صورت نمودار ہوئے بغیر نہ رہتی، اور قرآن شاید اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتاہے کہ یہ نہ ہو کہ سب کے سب ہی جہاد کیلئے نکل کھڑے ہوں بلکہ،

وَمَا کَانَ الْمُومِنونَ لِیَنفِروا کَآفَّۃً فَلَوْ لا نَفَر مِن کُلِّ فِرْقَۃٍ مِنھُمْ طآئِفَۃٌ لِّیَتَفَقَّھُوْا فِی الدِّین وَلِینذِرُوا قَوْمَھُمْ لَعَلَّھُمْ یَحْذَرُوْنَ (التوبہ۔ ۱۲۲)

اور مسلمانوں کو یہ نہ چاہیے کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تا کہ وہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور تا کہ یہ لوگ اپنی قوم کو جب کہ وہ ان کے پاس آئیں، ڈرائیں تا کہ وہ ڈر جائیں۔

شریعت کے باقی احکامات کی طرح یہ حکم بھی ہر زمانہ کے لئے ہے تاکہ ہر زمانہ کے مسائل کے مطابق قرآن و حدیث سے احکام کا استنباط کیا جاسکے۔لیکن المیہ یہ بنا کہ مسلمان اسلام کے اس اصول سے کما حقہ مستفیذ نہ ہوسکے اور خیرالقرون کے زمانہ کے بعد مسلم دنیا کی غالب اکثریت نے فقہ کے عمل کو جاری رکھنے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

تابعینِ کرام کے عمل سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ فقہ کے عمل کو جامد نہیں بنانا چاہتے تھے۔ اس کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے شاگردوں میں سے قاضی ابو یوسف اور امام محمد الشیبانی نے اپنے استا د سے دوتہائی مسائل پر اختلاف کیا ہے[۱۴] جس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ صرف ایک نسل کے شریعت میں غوروخوض نے امام ابوحنیفہ جیسے مجتہد کے استنباطی مسائل کی حیثیت کو چیلنج کردیا تھا۔لیکن اس کے بعد مسلمانوں میں تقلید کی روش نے مسئلہ کو اتنا گھمبیر کردیا کہ بجائے اس کے کہ وہ براہِ راست قرآن و حدیث سے مسائل کے احکامات کو اخذ کرتے انہوں نے انہی ماخوذ مجموعوں پر ہمیشہ کیلئے اکتفا کرلیا جو اپنے استنباط ہونے کے ایک نسل کے بعد ہی اپنی اہمیت کھو بیٹھے تھے۔[۱۵] اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کی فقہ کو سینکڑوں سالوں سے صرف چار گھروں تک محدود کردیا گیا۔ مسلمانوں کے سیاسی افتراق نے اس تقسیم کو مزید گہرا کردیا۔ ایسا یقیناً ہوا کہ ائمہ اربعہ سے اب تک بے شمار علماء نے شریعت کے مسائل کی تشریح وتفسیر کی لیکن ان کا دائرہ ان چارفکروں کی چار دیواری تک محدود رہا۔[۱۶]

یہ معاملہ تو مذہبی تعلیمات کا تھا۔ مسلمانوں کے حکومتی زوال کی بنیادی وجہ بھی یہی تقلیدی روش تھی، کیونکہ یہ روش ان حکمرانوں کے حق میں بہت مفید ثابت ہو اکر تی تھی جو اپنے ظلم یا نااہلی سمیت رعایا کے سروں پر مسلط رہنا چاہتے تھے اور ازمنہ وسطیٰ میں جمعہ کے خطبہ میں حکمرانوں کا نام ایک بہت بڑا مذہبی جواز تھا۔ اور افسوس ناک امر یہ ٹھہرا کہ یہ جواز فقہا کی جانب سے ہی دیا جاتا تھا

کیونکہ عام لوگ تو فقہا کے مقابلے میں تقریباً جاہل ہی تھے لہذا ان کے فیصلے کو مبارزت دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ یہ فقہا کوئی عام حیثیت کے مالک نہ تھے۔ ان میں امام غزالی، ابو یوسف، الماوردی اور نظام الملک جیسے نام آتے ہیں۔۱۷

اس روش کے متوازی ایک مسئلہ اور چل نکلا اور وہ تھا تصوف۔ فقہ کی قائم و دائم سخت شریعت سے نالاں لوگ تصوف کی رواداری میں سکون حاصل کرتے لیکن یہاں انہیں ضعیف الاعتقادی کا عارضہ لاحق ہوجاتا جس سے شریعت کے ظاہری اعمال ان کے لئے کوئی خاص حیثیت نہ رکھتے۔۱۸ ضعیف الاعتقادی سے قطع نظر تصوف کی یہ رواداری بھی کوئی صحت مندانہ رجحان پیدا نہ کرسکی اور خانقاہی نظام اپنے اندر ایک سلطنت بن گیا جس میں صوفیانہ نظام کی تقلید نے دنیاوی سلطنت کے تمام عواقب ظاہر کردیئے۔۱۹ نتیجتاً آج صوفیانہ عقائد کے حامل لوگ بھی اپنی فکر میں تقلید کا شکار ہیں اور اپنے نظریات سے ایک بالشت بھی ہٹنے کو تیارنہیں جو کہ انتہا پسندی کا مظہر ہے۔

مذہبی انتہا پسندی - عہد ماضی اور عہد حاضر کا فرق

عہد قدیم اور ازمنہ وسطیٰ کے بادشاہوں کی جنگیں مذہب کو آڑ بنا کر لڑی جاتی تھیں کیونکہ رائے عامہ کا مکمل تعاون حاصل کرنے کیلئے یہ ایک موثر حربہ ہواکرتا تھا۔ ازمنہ وسطیٰ کی صلیبی جنگیں اس سلسلہ کی بدترین مثال ہیں۔ جنگ میں فتح کے بعد مخالف قوم یا مخالف مذہب کے لوگوں کی جانوں اوراملاک پر تصرف کرنے کے لئے بھی مذہب کو آلہ جواز بنایا جاتا تھا۔رومیوں اور ساسانیوں کی طویل جنگیں، آریاؤں کا ہندوستان پر تصرف اور مفتوح اقوام کا قتل عام عہد ماضی میں انتہا پسندی کی واضح مثالیں ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عہدقدیم اور ازمنہ وسطیٰ کی بادشاہت کی سب سے بڑی خصوصیت، اس کا مقدس طاقتوں کی تائید کا دعویدار ہونا تھا۲۰ اور اس چیز کو حکومتی پروپیگنڈے کے ذریعے باقاعدہ رائے عامہ پر باور کرایا جاتا اوراس چیزمیں جو بادشاہ جتنا زیادہ کامیاب رہتا وہ اتنی ہی زیادہ رائے عامہ کی تائید کا مستحق ٹھہرتا۔ ازمنہ وسطیٰ کی مسلم سلطنت بھی اس چیز سے مستثنیٰ نہ تھی۔۲۱

عہد قدیم میں دنیا کا ایک خطہ البتہ ایسا ہے جسے مذہبی رواداری کی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے ؛ وہ ہے ہندوستان کے بدھ مت کا دورِ عروج۔ محمد بن قاسم کے حملے کے وقت ہندوستان کے معاشرے کی حالت مذہبی رواداری کے حوالے سے اتنی سلجھی ہوئی تھی کہ ایک گھر میں ایک بھائی

ہندو تھا تو دوسرا بدھ۔[۲۲] لیکن بدلتے ہوئے حالات میں بدھوں کے اس رواداری کے ساتھ انتہا پسندانہ تمسک کا نتیجہ یہ نکلا کہ بدھ مت کو اپنے پنپنے کی جگہ سے دیس نکالے کا سامنا کرنا پڑا۔[۲۳]

ازمنہ وسطیٰ میں مذہبی انتہا پسندی کے حوالے سے مسلم سلطنت کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔ اس چیز سے انکار نہیں کہ خیرالقرون کے زمانہ کے بعد مسلمانوں نے بھی دین کو سیاسی پشت پناہی کے لئے استعمال کیا لیکن مفتوح قوموں کے حوالے سے تقریباً تمام مسلم حکمرانوں کا معاملہ مذہبی رواداری پر مشتمل تھا۔ سپین میں مسلمانوں نے عیسائیوں کو امن و امان دیا اور ان کا یہی طرزِ عمل آٹھ صدیوں بعد ان کے لئے وبالِ جان بن گیا کہ جب سلطنت کی باگ ڈور عیسائیوں کے ہاتھ آئی تو ان کی مذہبی انتہا پسندی نے سپین کی سر زمین پر کسی مسلمان کا زندہ رہنا گوارا نہ کیا۔ سندھ کا معاملہ اس سے بھی زیادہ سلجھا ہوا نظر آتا ہے کہ محمد بن قاسم نے فتح کے بعد تمام انتظام مقامی لوگوں کے ہاتھ میں ہی رہنے دیا۔[۲۴] اس کا ایک باعث یہ بھی تھا کہ ہندو معاشرہ یورپ کے عیسائیوں کی نسبت مہذب اور کم سرکش تھا۔ ظہیر الدین بابر نے گو رانا سنگرام کے ساتھ جنگ کو جہاد کا نام دیا[۲۵] لیکن ہندوستان پر قبضہ کے بعد جب عبدالقدوس گنگوہی نے اسے یہ ہدایت کی کہ ہندوانہ رسومات پر پابندی عائد کردی جائے تو اس نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی حالانکہ عبدالقدوس گنگوہی کے ساتھ بابر کو بہت عقیدت تھی۔[۲۶] یہ چیز بجا طور پر ان کے دین کی تعلیم تھی جو ایک صحت مندانہ رجحان تھا۔ اسی رجحان کی بدولت حجاج بن یوسف کے اجماع کرانے پر فقہا نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ ہندوؤں کو مشابہ اہل کتاب قرار دیا جائے۔[۲۷] حالانکہ اس کے بعد بھی کئی مواقع پر اور دورِ حاضر میں بھی ہندوؤں کو قتل کرنے یا لونڈی غلام بنانے کی ہی بات ہوتی رہی ہے جو کہ واضح طور پر ابتدا میں قائم شدہ ایک رائے کی اندھی تقلید کا اثر ہے۔ یہ معاملہ حکومتی حوالے سے تھا، علمی حوالے سے مسلمان سائنسدانوں نے سائنسی علوم میں جو بیش بہا تحقیقات کیں ان کا سب سے بڑا محرک بھی ان کے دین کی تعلیم تھی کہ کائنات میں زیادہ سے زیادہ غور وفکر کیا جائے۔ لیکن اس دین میں جب تقلید نے جمود پیدا کردیا تو اس کا اثر ان علوم پر بھی پڑا اور رہی سہی کسر منگولیا اور سپین کے وحشیوں نے پوری کردی۔ مسلم حکومتوں کے تحت قائم مسلمانوں کی قائم کردہ درس گاہیں ایک لمبے عرصہ تک علم کی روشنی پھیلاتی رہیں۔ اس میں تو کوئی دوسری رائے ہے نہیں لیکن یورپی اقوام کے عروج اور زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے جدید طریقوں

نے مسلم دنیا کے سینکڑوں سال پہلے کے فرسودہ نظام کے لئے کوئی جگہ باقی نہ چھوڑی اور اس حقیقت کے باوجود بھی مسلم دنیا کے اپنے پرانے نظام سے تمسک کی روش نے انہیں ذلت و پستی کے گہرے گڑھے میں گرادیا اور وہ ہنوز اس ذلت کو ذلت تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔

عہد حاضر

یہ عہد ماضی کا ایک مختصر جائزہ تھا ، اب ہم عہد حاضر کو دیکھتے ہیں۔ عہد حاضر میں مسلم قومیت کو بدستور ذلت کا سامنا ہے۔ غیر مسلم اقوام اگرچہ ہر قسم کے علوم وفنون میں بہت ترقی کرگئی ہیں اور انہوں نے اپنی تہذیب کو باقاعدہ دنیا کے سامنے اجاگر کروایا ہے لیکن مسلمانوں کے ساتھ معاملہ میں ان کو ان کا سیکولرزم دامن گیر نہیں رہتا اور وہ بدستور اسے مذہب کی آنکھ سے ہی دیکھتے ہیں ، گو ظاهری طور پر وہ اس کی نفی ہی کریں۔ مشرقی تیمور کا ذکر ہم اس سے پیشتر کرچکے جبکہ مسلم دنیا کے تنازعات اول تا آخر جو ں کے توں قائم ہیں۔ کشمیر، فلسطین، بوسنیا اور چیچنیا اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ عہدماضی کی نسبت اس مذہبی انتہا پسندی میں شدت اس حوالے سے پائی جاتی ہے کہ اب صرف کسی خطہ زمین پر قبضہ کا مسئلہ نہیں بلکہ مغرب نے جو تہذیب قائم کی ہے، جس میں بہت سی خامیاں بھی پائی جائی ہیں، وہ اسے ساری دنیا پر مسلط کردینا چاہتے ہیں اور مسلم دنیا کو بڑی حد تک اپنے رنگ میں رنگنے کے باوجود وہ اس سے خائف ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کہیں وہ آفاقی نظام مسلمانوں کے ذہنوں میں جاگ نہ پڑے جس نے چودہ صدیا ں قبل چشم زدن میں دنیا کے کونوں کو سمیٹ لیا تھا۔سوویت یونین نے اس سلسلہ میں اپنی بھرپور کوشش کی کہ کمیونزم کو دنیا پر پھیلادے لیکن اس میں بھی انتہا پسندی کا جذبہ کارفرما تھا، یہی وجہ تھی کہ ایک انقلابی نظام ہونے کے باوجود کمیونزم ایک مذہب کی شکل اختیار کر گیا۔[۲۸] اب وہی کام امریکہ کررہاہے۔ یہاں ایک دلچسپ نکتہ کی طرف اشارہ کرتے چلیں کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مغرب کا سارا ڈر مسلمانو ں کی اسی انتہا پسندی کے باعث ہے جوانہوں نے اپنائی ہوئی ہے اور اسی چیز کو مغربی تہذیب اپنی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خیال کرتی ہے۔لیکن مسلمانوں کی یہ انتہاپسندی ایک رکاوٹ ہونے کے باوجود کوئی موثر طرزعمل بہر حال نہیں۔

علمی حوالے سے بات کریں تو مغرب کا نظام کافی سلجھا ہوا نظر آتا ہے کہ وہاں علوم کے سلسلے

میں اظہارِ رائے کی مکمل آزادی ہے اور یہی سبب ہے کہ وہاں کسی کو اسلام قبول کرنے میں کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں ہے۔ لیکن مسلم دنیا کی حالت اس حوالے سے بہت مایوس کن ہے۔ وہ مسلمان جو کبھی یونانی اور ہندوستانی فلسفہ کو نہ صرف پڑھنے کی اجازت دیتے تھے بلکہ خود اپنی سرپرستی میں اس کے تراجم عربی اور فارسی میں کروایا کرتے تھے آج وہ اپنے علمی نظریہ میں بہت محدود نظر آتے ہیں۔ درسِ نظامی میں عباسی دور کا فلسفہ اور منطق تو بدستور چلا آرہا ہے لیکن دورِ جدید کا فلسفہ کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں۔ یہ تو مذہبی طبقہ کا حال ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی پڑھنے والوں کا حال کچھ اس سے زیادہ بہتر نہیں۔ دین کے علم کو ہم نے اسلامیات لازمی اور جمعہ کے خطبہ تک محدود کررکھا ہے۔ جدید علوم پڑھنے والے مذہب کی بحث سے جان چھڑانے کے لئے اس سے ویسے ہی کنارہ کش ہوجاتے ہیں اور اپنی مذہبی حالت کو خوشی اور مرگ کی رسومات تک محدود کردیتے ہیں۔ جبکہ جو کوئی دین کے ساتھ اس سے کچھ بڑھ کر تعلق رکھنے کا خواہاں ہوتا ہے وہ اپنے محدود علم اور اپنے قریبی عالم یا پیر سے ابدی تمسک کی بدولت فرقہ پرستی اور تقلید کے اندھے کنویں میں گرجاتا ہے اور دین اور دنیا کے معیارات کو الگ الگ قائم کئے ہوئے ہے۔ خطرناک صورتحال عقائد کے معاملہ میں بنی ہوئی ہے۔گو وہ عہد حاضر کے ساتھ مخصوص نہیں لیکن قابلِ غور اس حوالے سے ہے کہ دورِ حاضر میں تعلیم کا عام ہونا بھی اس کا سد باب نہ کرسکا۔ جنہیں ہم پڑھے لکھوں میں شمار کرتے ہیں وہ ضعیف الاعتقادی کے باعث بڑی دور کی گمراہی میں پڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان طبقے سے قطع نظر وہ لوگ جو واقعتاً دین کو خلوصِ دل سے سمجھنا اور اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی طرح سے انتہاپسندی کے المیہ کا شکار ہیں۔ ایسی جماعتیں جو دینی ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی بھی ہیں، وہ دین کو اپنی سیاست کے مطابق اختیار کئے ہوئے ہیں۔ جو جماعتیں تبلیغی مقاصد کے لئے قائم ہوئی ہیں وہ ہر مسئلہ کا مداوا تبلیغ میں خیال کرتے ہیں، جو جہاد کی جانب راغب ہیں وہ تمام مسائل تلوار سے حل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مختلف افراد نے دین کے مختلف کونوں کو سنبھال کر اسی پر اکتفا کئے بیٹھے ہیں اور کسی متفقہ روش کو قائم کرنے کی کوئی کاوش نظر نہیں آتی۔ عہد ماضی کی نسبت سے یہی ہے وہ شدت کہ لوگ پڑھے لکھے ہیں، جدید تعلیم سے آراستہ ہیں، میڈیا کی بدولت دنیا کے حالات سے آگاہ ہیں لیکن اپنے اپنے خول میں بند رہ کر مسائل

کوحل کرنا چاہتے ہیں اور ایک دوسرے سے تعاون کو تیار نہیں۔ اس کا واحد سبب اپنے اپنے مذہبی نظریات سے مقلدانہ تمسک ہے جو انہیں انتہاپسندی کے دائرہ سے باہر نہیں آنے دیتا۔اس سلسلہ میں شخصیت پسندی کا بہت کچھ عمل دخل ہے۔ لوگ جس شخصیت میں کچھ اچھائی دیکھ کر اس سے تمسک اختیار کر لیتے ہیں اس کی ہر صحیح غلط رائے کو جواز دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات

شریعتِ محمدی کے نزول کو چودہ سو سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے اور اس طویل عرصہ میں قرآن وحدیث کی مختلف تشریحات سے مسلم قومیت میں بعدالمشرقین والمغربین کا تفاوت پیدا ہوچکا ہے۔ لہٰذا انسانی رویوں کے متعلق کسی مسئلہ کو اسلام کی تعلیمات کے ذریعے سمجھنا ایک احتیاط طلب کام ہے۔اگر اس میں کسی جگہ ہم حالات و واقعات کے تناظر سے کسی چیز کو نظر انداز کردیں تو معاملہ شاید انتہا پسندی کی طرف چلا جائے۔ لہٰذا جب ہم مسئلہ ہی انتہا پسندی کا اٹھا رہے ہیں تو اس بابت تو احتیاط کا تقاضا مزید بڑھ جاتاہے۔

انتہا پسندی کا مقابل جذبہ اعتدال پسندی ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام کی خوبی یہ ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں کی تعلیم کے لئے ایک ہفتہ وار ریفریشر کورس قائم کیا ہے، جسے ہم خطبہ جمعہ کے نام سے جانتے ہیں۔ ہر جمعہ ہر منبر سے یہ الفاظ دہرائے جاتے ہیں **خیر الامور اوسطھا** کہ بہترین کام وہ ہیں جو اعتدال روی پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا اسلام نے اپنے پیروؤں کو اعتدال کے سبق کی یاددہانی کے لئے ایک مسلسل انتظام کیا ہے۔

اب ایک اور پہلو کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ حدیث کے مطابق عرشِ الٰہی پر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں کہ

رحمتی سبقت غضبی [۲۹]

میں رحم (مہربانی) کرنے والا ہوں عذاب ڈالنے سے پہلے(اللہ اہمیت دیتا ہے اپنی رحمت کو عذاب کی نسبت)

جبکہ پیغمبر انسانیتﷺ کے بارے میں ارشاد ہوا

وما ارسلنک الا رحمة اللعالمین (الانبیاء.۱۰۷)

اللہ رب العزت کی یہ رحمت تمام جہانو ں کے لئے ہے اور اسی لحاظ سے اسلام کی تعلیمات جہاں عالمگیر ہیں وہاں ابدی بھی ہیں۔ اس کے بے شمار دلائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسلام کی تعلیمات جس طرح سے رسولﷺ کے عملی نمونہ کے ساتھ مزین ہیں اور اپنی اصل شکل میں ہمارے پاس موجود ہیں، اس کی کوئی دوسری نظیر پیش نہیں کی جاسکتی۔ اگرچہ ہمارا ایمان ہے کہ باقی انبیا کی زندگیا ں بھی تعلیماتِ الہیہ کے مطابق ہی ہیں لیکن ان کے بہت کم حالات آج دنیا کو معلوم ہیں۔**۳۰** لہٰذا ایسی تعلیمات کا لوگوں کو انتہا پسندی کی طرف راغب کردینا بعید از امکان ہے۔ بات ہورہی تھی رسولﷺ کی رحمت کی، تو یہ رحمت جتنی وسیع ہے اسی قدر اس رحمت سے صادر ہونے والی تعلیمات اپنے معنوں اورعمل میں وسعت کی حامل ہیں۔ اسے ہم ایک روایت کے ذریعے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

> حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے ظہر اور عصر کو اور مغرب اور عشاء کو مدینہ میں بغیر خوف اور بارش کے جمع کیا۔ابن عباسؓ نے رسولﷺ سے دریافت کیا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تو آپﷺ نے فرمایا کہ امت کو حرج(سختی) نہ ہو۔**۳۱**

امام نوویؒ اس بارے میں رقم طراز ہیں:

> یہ سب روایتیں صحیح ہیں اورمسلم میںآچکی ہیں اور علما ء کی اس میں کئی تاویلیں ہیں اور کئی مذہب ہیں۔ اور ترمذی نے اپنی کتاب کے آخر میں کہا ہے کہ میری اس کتاب میں کوئی حدیث ایسی نہیں جس کو ساری امت نے چھوڑ دیا ہو، مگر ابن عباسؓ کی حدیث مدینہ میں دو نمازیں جمع کرنے کی بغیر خوف اور مینہ کے اور حدیث قتلِ شارب خمر کی جو چوتھی مرتبہ شراب پیوے اور ترمذی کا یہ قول کہ جو شارب خمر کے باب میں ہے ٹھیک ہے کہ اجماع کی رو سے وہ منسوخ ہوچکی ہے، رہی ابن عباسؓ کی یہ حدیث، اس کے عمل ترک کرنے پر اجماع نہیں ہوا۔**۳۲**

ہماری مروجہ فقہ میںتو اس چیز کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی گئی کہ اس حدیث پر کچھ بھی غوروفکر کیا جائے، لیکن اہل حدیث مکتبہ فکر جو براہِ راست حدیث میں غوروفکر کا قائل ہے، ان کا عمل بھی اس پر نظرنہیں آتا۔ اس کا باعث یہ ہے کہ دین کے حوالے سے امت کا مزاج ہی اس طرح کا بن گیاہے کہ وہ شروع کے محدثین اورفقیہوں کی قائم کردہ آراء سے آگے بڑھ جا نا ایک بے جا جسارت تصور کرتے ہیں۔ تقلید کی یہ بحث تو اس سے پیشتر ہوچکی، ہم اس حدیث سے حاصل ہونے والی تعلیم

پر توجہ دیتے ہیں۔ اس حدیث میں رسولﷺ کا جوعمل بیان کیا گیا ہے، اس کے ساتھ واضح طور پر اس کی حکمت بھی بیان کی گئی ہے کہ یہ امت کی آسانی کیلئے ہے۔ اب یہاں تاویل کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے ؟آیئے اب مسئلہ کے حاصل کلام کی طرف کہ کیا آج کے مصروف دور میں، خاص کر ان دنوں میں جب دن کا دورانیہ کم ہوتا ہے، رسولﷺ کا یہ عمل امت کو آسانی فراہم نہیں کررہا؟ اور اگر اس پرعمل نہیں کرنا ہوتا تو پھر امت پر آسانی کے بیان کے کیا معنی؟

یہ ہے ایک خصوصی مطالعہ، اور موضوع کے حوالے سے اس کا مقصود یہ ہے احکامات اور اعمال میں سختی کا تدارک رسولﷺ کی تعلیمات میں موجود رخصتوں کو رائج کرکے کیا جاسکتا ہے ، جیسا کہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ جب بھی رسولﷺ کو دو کاموں میں اختیار دیا گیا تو آپﷺ نے ان میں سے زیادہ آسان کام کو اختیار کیا بشرطیکہ وہ گناہ کا کام نہ ہوتا۔ اگر وہ گناہ کا کام ہوتا تو آپﷺ سب سے زیادہ اس کام سے دور بھاگنے والے تھے۔**۳۳** رسولﷺ کا یہ معاملہ اپنی ذات کے بارے میں تھا، جس میں استثنائی صورتیں بھی موجود ہیں جس طرح کہ رسولﷺ نے دنیا اور آخرت میں سے آخرت کو اپنے لئے پسند فرمایا**۳۴** جبکہ رخصت کا کام دنیا کو پسند کرنا تھا۔ یہی معاملہ نمازوں کے بارے میں تھا کہ جمع صلوٰتین کو اپنے طریقے میں ضرور رکھا لیکن مُداومَت نماز پنجگانہ پر ہی فرمائی۔ یعنی رسولﷺ نے امت کی ہر طرح سے رہنمائی کے لئے عزیمت اور رخصت دونوں کو اپنے عمل سے ظاہر کیا، لیکن وہ لوگ جو عزیمت اختیا رکریں انہیں دوسروں کے لئے آسانی پیدا کرنے کی ہدایت کی گئی لہٰذا اصل مسئلہ سوچ کی انتہا پسندی کا ہے، جب وہ اعتدال پر آئے گی تو معاملات بھی اعتدال پر آئیں گے اور دین کامعاملہ جو آجکل سخت بنا ہواہے، وہ آسان ہوجائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ دین کو آسان بنایا گیا ہے اور اس میں مشکل نہیں، لہٰذا ارشاد ہوا:

وما جعل علیکم فی الدین مِن حرج (الحج.۷۸)

اس نے تمہیں برگزیدہ بنایا ہے۔ اورتم پر دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں ڈالی۔ (الحج ۷۸)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رسولﷺ نے انتہا پسندی کے عنصر کے خاتمے کیلئے نرمی کے رویوں کو فروغ دینے کی کوشش کی اور شاید اسی لئے یہ بات فرمادی ،’’جس چیز میں بھی نرمی ہوتی ہے وہ اسے زینت دار بنادیتی ہے اور جس سے یہ نکال لی جاتی ہے اسے عیب دار بنا دیتی ہے‘‘۔**۳۵** اور حقیقت

میں یہی وہ رویہ ہے جو معاشرے میں حسن پیدا کر تا ہے جبکہ انتہا پسند ی سے اصلاحِ احوال کے ضمن میں کو ئی مثبت نتیجہ پیدا نہیں کیا جاسکتا اور اس بات کو رسولﷺ نے ان لفظوں میں پرویا :

بے شک اللہ تعالیٰ نرمی کرنے والا ہے، نرمی کو پسند فرماتا ہے اور نرمی پر جو کچھ وہ عطا فرماتا ہے وہ سختی پر اور اس کے علاوہ کسی چیز پر عطا نہیں فرماتا۔ ۳۶

اور آخر میں وہ روایت ہے جو خاص طور پر مبلغین اور ذمہ داران کے لئے زیادہ اہمیت کی حامل ہے :

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا ،''آسانی کرو، سختی نہ کرو۔ خوشخبری دو اور نفرت مت دلاؤ''۔۳۷

سیاست، معاشرت ااور عبادات کے معاملات کو اس طرح سے سلجھایا جاسکتا ہے لیکن عقائد کے معاملات میں ایسی کسی روش کو اپنانا، گویا دین کا حلیہ بگاڑنے کے مترادف ہیں۔ اس کے باوجود اسلامی تعلیمات کی خوبی یہ ہے کہ یہاں انتہا پسندی کے مقابلہ میں حکمت اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ لہٰذا ارشاد ہوا :

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ و الموعظۃ الحسنۃ (النحل.١٢٥)

اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کی حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلائیے اور ان سے بہترین طریقے سے گفتگو کیجئے۔(النحل ۱۲۵)

ہم بیان کرآئے ہیں کہ عقائد کے بنیادی معاملات میں بڑی شدید قسم کی انتہا پسندی دیکھنے میں آتی ہے۔ تعلیمات نبویہؐ میں اس چیز کا سد باب جو ہمیں نظر آتا ہے وہ اس طرح سے ہے کہ رسولﷺ نے امت کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں عقائد کے جو مسائل قرآن و حدیث میں بیان ہوئے ہیں انہیں عام فہم بنا کر عمومی تعلیم میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر قرآنِ مجید کے مطالعہ کی کثرت کی جائے کیونکہ قرآن عقائدکے معاملات کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتاہے۔اور اس سلسلہ میں رسولﷺ کی تعلیما ت بہت واضح ہیں۔ لہٰذا فرمایا:

بلغو عنی ولو آیة (مسلم)

لیکن ساتھ ہی تنبیہہ فرمادی کہ جس شخص نے مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ (بخاری)اور یہ بھی کہ کسی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ جو کچھ سنے اسے بلا

تحقیق بیان کردے۔ (مسلم)

دوسرا معاملہ اس سلسلہ میں شخصیت پرستی کا ہے۔ اس معاملہ میں رسول اﷲﷺ نے خود اپنی ذات کے حوالے سے امت کو تعلیم دی۔ وہ صحابہؓ کو اپنے بارے میں کسی قسم کا غلو کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، لہٰذا فرماتے کہ میری اس قدر مبالغہ آمیز مدح نہ کیا کرو جس قدر نصاریٰ ابن مریمؑ کی کیا کرتے ہیں، میں تو خدا کا بندہ اور اس کا فرستادہ ہوں۔۳۸ اسی طرح سے قیس بن سعدؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حیرہ گیا، وہاں لوگوں کو دیکھا کہ رئیس شہر کے دربار میں جاتے ہیں تو اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ آنحضرتﷺ کی خدمت میں واقعہ بیان کیا اور عرض کی کہ آپﷺ کو سجدہ کیا جائے کہ آپﷺ اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ آپﷺ نے فرمایا ،' تم میری قبر پر گزرو تو سجدہ کرو گے؟ '۔ کہا: نہیں ! تو فرمایا کہ جیتے جی بھی سجدہ نہیں کرنا چاہیے۔۳۹ یہ معاملہ تھا تعظیم کا جس سے تعلیم دینا یہ مقصود تھی کہ کسی شخصیت کو برگزیدہ مان کر اس کی تعظیم میں غلو نہ کیا جائے کجا یہ کہ اس کے اعمال و افعال کے پیچھے لگا جائے بجز حکم الٰہی کی اطاعت میں

فان تنازعتم فی شی فردہ الی اللہ ور سولہ ان کنتم تومنون باﷲ والیوم الآخر ط ذلک خیر و احسن تاویلا ط (النساء۔۵۹)

> پھر اگر کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے لوٹاؤ اللہ تعالی کی طرف اور رسول کی طرف، اگر تمہیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہے۔ یہ بہت بہتر ہے اور با اعتبار انجام کے بہت اچھا ہے۔
> (النساء ۵۹)

غیرمسلموں سے رواداری

اس معاملہ میں بھی رسولﷺ کی تعلیمات بہت عمدہ ہیں۔یہا ں دو حوالوں کے ذریعے ایک لطیف نکتہ کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا کہ اسلام چونکہ دنیاکے تمام انسانوں اور قیامت تک کے زمانوں کے لئے ہے، اس لئے دینِ محمدیؐ کے آ جانے کے بعد تما م دنیاکے انسان قیامت تک کے لئے ایک قوم تصور ہوں گے، البتہ ان کی آگے مزید تقسیم مسلمین اور غیر مسلمین میں کردی گئی ہے۔اس سلسلہ میں ایک روایت تو وہ ہے کہ جب احد میں رسولﷺ زخمی ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہا کہ وہ قوم کیا فلاح پاسکتی ہے جو اپنے پیغمبر کو زخمی کرتی ہے۔۴۰ یہاں آپﷺ نے مشرکین کو باوجود نظریہ

کے تصادم کے اپنی قوم کہا اور اللہ نے اس کی تردید نہیں فرمائی، بلکہ اتنا کہنے پر اکتفا کیا **لیس لک من الامر شیءً**

اس معاملہ کو باقی انبیاؑ کے حوالے سے بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ گذشتہ قومیں ساری کی ساری اپنے نبیوں پر ایمان نہیں لاتی تھیں لیکن پھر بھی انہیں اپنے نبی کی طرف ہی منسوب کیا جاتا تھا۔ لہٰذا نبیﷺ کی بعثت کے بعد سے تمام دنیا کے لوگوں کو اگر محمدﷺ کی امت کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو اس شرط کے ساتھ کہ مسلم اور کافر کی تفریق کو ملحوظ رکھا جائے۔

اس نکتہ کو اٹھانے سے مقصود یہ ہے کہ کفر کے اصلاح کے لئے متعصّبانہ یا انتہا پسندانہ رویہ اختیار کرنے سے گریز کیا جائے۔ اس سلسلہ میں اس حد تک رہنمائی کی گئی کہ ارشاد ہوا:

> **ولا تسبو ّالّذین یدعون من دون اللہ فیسبّو اللہ عدواً بغیر علم ط (الانعام. ۱۰۸)**
>
> اور دشنام مت دو ان کو جن کی یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں کیونکہ پھر وہ براہِ جہل حد سے گزر کر اللہ کی شان میں گستاخی کریں گے۔

دیگر مذاہب کا معاملہ

مطالعہ قرآن کے ذریعے ہم بہت سے دیگر مذاہب کے حالات سے آگاہ ہوتے ہیں اور اسی طرح ان کے عقائد کا بھی ذکر کیا گیا ہے، خواہ یہ ذکر ان کی تردید کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔حتیٰ کے ایک رائے کے مطابق بدھ مت کا ذکر بھی بڑے لطیف پیرائیہ میں کردیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا، **والتین والزیتون و طور سنین و ھذاالبلد الامین** ۔ یہاں چار شخصوں کا ذکر آیا ہے۔ زیتون سے حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ ہے، جن کو جبل زیتون سے بہت قریبی تعلق رہا ہے اور سینا سے حضرت موسیٰ کی طرف اشارہ کیا گیا، جہاں خدا نے انہیں تورات عطا فرمائی۔ '**ھذاالبلد الامین**'یعنی محفوظ شہر سے مراد مکہ معظّمہ ہے۔ لیکن والتین سے کیا مراد ہے۔ مفسرین اس ضمن میں مختلف انبیا کی طرف اشارہ کرتے ہیں، لیکن ان کی زندگی انجیر سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتی تھی جبکہ مناظر احسن گیلانی کے مطابق، گوتم بدھ کے ماننے والوں کا متفقہ بیان ہے کہ گوتم بدھ کو جنگلی انجیر کے نیچے نروان حاصل ہواتھا۔[۴۱] اگر اس بات کو درست تسلیم کرلیا جائے تو اس پر مزید یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ شاید اس وجہ سے ہے کہ مذہبی رواداری میں اسلام کے سب سے قریب بدھ مت ہی ہے۔

لہٰذا قرآن مجید کو پڑھنے والے کا فریضہ یہ بھی ہوگا کہ تفسیر یا دوسرے وسائل کے ذریعے سے ان مختلف ادیان کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرے۔ ایسی معلومات تبلیغِ دین کے سلسلہ میں بھی کارآمد ہوسکتی ہیں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں سے مناظرے کے وقت بھی۔ اور یہ معاملہ مزید قوت پکڑ جاتا ہے جب ہم اس سلسلہ میں تعلیمات نبویہﷺ کو بھی موجود پاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے ایک مرتبہ رسولﷺ سے عرض کیا کہ وہ خواب میں دو انگلیاں چوس رہے ہیں، ایک سے تو شہد نکل رہا ہے اور دوسری سے دودھ۔ رسول اللہﷺ نے فرمایا، ''قرآن مجید اور تورات دونوں سے استفادہ کرسکو گے''۔چنانچہ بعد میں انہوں نے سریانی زبان کی بھی تعلیم پائی اور بائبل کا ترجمہ سریانی زبان میں پڑھتے۔۴۲ یہ بات لازماً ہے کہ تورات پڑھنے پر حضرت عمرؓ کو زجر کیا گیا تھالیکن ایک تو وہ بات شروع کے زمانہ کی تھی جب ابھی مسلمانوں کا شعور اتنا پختہ نہ ہواتھا گوحضرت عمرؓ کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جاسکتا لیکن اس سے دوسرے لوگوں کو روکنامقصود ہوسکتا تھا جو وہاں موجود تھے۔

اسی طرح بعض دفعہ یہودی جھگڑنے کی نیت سے رسولﷺ سے مسائل دریافت کرتے تو آپﷺ سب سے پہلے انہیں تورات ہی کی طرف متوجہ کرتے اور خاص اس مقصد کے لئے کہ یہود تورات کے معاملہ میں غلط بیانی نہ کرسکیں آپﷺ نے زید بن ثابتؓ کوعبرانی سیکھنے کو کہا تاکہ وہ ان کی تصدیق یا تکذیب کرسکیں، تو زید بن ثابتؓ نے عبرانی زبان سیکھی۔۴۳ بحث کا مقصود یہ ہوا کہ علمی حوالے سے غیرمسلموں سے ایک قریبی تعلق کا ہونا عین تعلیماتِ نبویہؐ کے مطابق ہے کیونکہ اس سلسلہ میں انتہا پسندی کوئی نفع ہرگز نہیں دے سکتی۔

رسول اللہﷺ کی سیرت کی بات کریں تو غیرمسلموں سے رواداری کے ضمن میں سب سے پہلے تو عبداللہ بن ابی کامعاملہ ہے کہ جب ایک مسئلہ پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہﷺ اجازت دیجئے میں اس منافق کی گردن اڑادوں تو آپﷺ نے فرمایا،'لوگ چرچا کریں گے کہ محمدﷺ اپنے ساتھیوں کوقتل کردیتا ہے'۔۴۴ اسی طرح جب کبھی مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان کوئی معاملہ پیش آتا تو مسلمانوں کی بلاوجہ جانب داری نہ فرماتے۔ ایک دفعہ ایک یہودی نے آکر شکایت کی، 'محمد! دیکھوایک مسلمان نے مجھے تھپڑ مارا'۔آپﷺ نے اس مسلمان کو اسی وقت بلا کر زجر فرمایا۔۴۵

جہاد اور انتہا پسندی

رہا معاملہ مسلمانوں کی گذشتہ اور موجودہ صدی کی جہادی تحریکوں کا، اس سلسلہ میں تعلیمات نبویہؐ ان مجاہدین کو اپنی روش سے ہٹا دینے کا براہِ راست حکم اپنے اندر نہیں رکھتیں کیونکہ جہاد کی یہ روش انتہا پسندی کی بجائے مغربی استعماریت کا ردِ عمل ہے۔ البتہ تعلیمات نبویہؐ بالواسطہ طور پر ان کا حل اس طرح سے پیش کرتی ہیں کہ رسول ﷺ کی زندگی حکمرانوں کے لئے بھی اپنے اندر ایک مکمل نمونہ رکھتی ہے تو اسوۂ رسول ﷺ مسلم حکمرانوں کو یہ راہِ عمل بتاتا ہے کہ استعماریت کے خلاف اپنی پوزیشن مضبوط کریں تاکہ معاملات، وہ جنگ کے ہوں یا صلح کے، حکومتوں کے درمیان طے پائیں اور عوام اس میں کودنے پر مجبور نہ ہوں۔ چونکہ مذہب کی نمائندگی حکومت کی نسبت رائے عامہ سے زیادہ ہوتی ہے، اس لئے عوام کے براہِ راست ٹکراؤ سے حرف مذہب پر آتا ہے۔

حرفِ آخر

اس سے پیشتر ہم بیان کرچکے ہیں کہ اسلام کا کوئی کلیسا نہیں جو اپنے پیروؤں کو احکام کی ایک مشترک تفسیر پیش کرسکے۔ انتہا پسندی کا معاملہ بھی یہی ہے کہ کوئی ایسی عدالت موجود نہیں جو اعتدال کی حدود و قیود کو متعین کرسکے۔ قرآن وحدیث کو ایک مشترکہ بنیاد قرار دینا مسئلہ کی ایک انتہائی سادہ صورت ہے۔ ہر انتہاپسند نقطہ نظر کی بحث کا آغاز قرآن وحدیث کے دلائل سے ہی کیاجاتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے طویل دور میں پنپنے والی روایات قرآن وحدیث سے زیادہ مضبوط حیثیت کی حامل بن چکی ہیں۔ اور ان روایات کا بیشتر حصہ انتہاپسندی کے اصولوں پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اسلامی تعلیمات ان روایات کی بیخ کنی سے قاصر ہیں بلکہ جو کچھ ہم پیش کرچکے ہیں، انتہا پسندی کے سدِ باب کا اس سے موثر ذریعہ شاید ہی کوئی اور ہو۔ مسئلہ ہے ان تعلیمات کو عمل میں لانے کا اور اس سے بھی اہم مسئلہ ہے کہ عمل میں لانے کا لائحہ عمل کیا ہو۔ اسی چیز کے جواب پر ہم اپنی بحث کو سمیٹتے ہیں کہ سیاسی یا مذہبی رجحان کی بجائے قوم کے اندر علمی رجحان کو فروغ دیا جائے۔ یہی رجحان مغرب کی ترقی میں کارفرما رہاہے۔ بہر حال یہ ایک رائے ہے جس کے حتمی ہونے کے متعلق ہم کسی زعم میں مبتلا نہیں ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ *آکسفورڈ انگلش ڈکشنری*، جلد۳ (لندن: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۸) لفظ Extreme کے تحت عبارت۔

۲۔ کم حیثیت کا اس حوالے سے کہ استبدادی نظام میں لوگوں کو اپنی شناخت قائم رکھنے کا ایک ہی ذریعہ نظر آتا ہے کہ وہ برادری کے اکابر کو اپنی وفاداریاں سونپ دیں اور بے عمل کا اس حوالے سے کہ ذہن کے نہاں خانوں میں آخرت کی جوابدہی کا خوف لوگوں کو برگزیدہ ہستیوں کے ساتھ توہماتی تمسک کی رغبت دلاتا ہے، جس سے صرف انہیں آخرت کے تصور سے نجات کی تسلی دیتا ہے بلکہ دنیا کی مشکلیں حل کرنے کی بھی یقین دہانی کراتا ہے۔

۳۔ *آکسفورڈ انگلش ڈکشنری آف پولیٹیکل تھاٹ* میں بنیاد پرستی کی تعریف اس طرح سے کی گئی ہے، ''کسی مذہبی گروہ کے اندر ایک ایسی تحریک جس کا مقصد اس مذہب کے اصلی اور بنیادی عقیدے کی طرف مراجعت ہو اور جو باہر سے آنے والے معاشرتی اور اخلاقی تقاضوں کے لئے گنجائش پیدا کرنے سے انکار کرتی ہو۔ سیاسی اصطلاح میں بنیاد پرست ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو کسی سیاسی مسلک کی ابتدائی شکل پر سختی سے کاربند رہنا چاہتے ہوں اور اس سے کسی قسم کے انحراف کی اجازت نہ دیتے ہوں''۔ بحوالہ ''القلم'' جلد۲، شمارہ ۶، ص۱۱۵

۴۔ اسلام کے حوالے سے اس چیز کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اسلامی احکامات اور اسلامی روایات دو مختلف چیزیں ہیں۔ احکامات نص پر مشتمل ہوتے ہیں جبکہ روایات اسلاف کی فکر کے ایک لمبے عرصہ تک صحیح تسلیم کرنے سے معرض فکر میں آتی ہیں۔

۵۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں احیاءِ دین کی تقریباً تمام تحریکوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان تحریکوں کا بغور مطالعہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ ان کی ناکامی میں غیروں کی مادی برتری کی نسبت اپنوں کی غیر جانبداری کی کارفرمائی زیادہ ہے۔ آئی ایچ قریشی جنگِ آزادی کے بارے میں رقمطراز ہیں، ''اکثر والیانِ ریاست اور بہت سے صوبوں نے بغاوت کو قرین مصلحت نہیں سمجھا تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ صوبے عوامی جذبے کی نمائندگی کرتے تھے، اس کے معنی صرف یہ تھے کہ وہ محتاط تھے''۔ اشتیاق حسین قریشی، *برِصغیر پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ*، مترجم: ہلال احمد زبیری (کراچی: کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۹) ص۔ ۳۰۰، یہ احتیاط لازمی طور پر اپنی جانو ں اور مالوں کے متعلق تھی جس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ ان والیان کے نزدیک 'باغیوں' کی جان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس سلسلہ میں ایک استثنائی صورت عرب کی وہابی تحریک ہے لیکن اس کی کامیابی توہمات اور ضعیف الاعتقادی کے خاتمے تک محدود ہے جبکہ عرب معاشرے کا فکری جمود عصرِ حاضر میں اپنی نظیر نہیں رکھتا اور شاید عالمِ اسلام کے لئے سب سے بڑی ہزیمت ہے۔

۶۔ تاجِ برطانیہ بھی اس پالیسی سے کچھ زیادہ بے اعتنائی نہ دکھا سکی گو انہوں نے اس مقصد کے لئے زیادہ مہذب طریقے اختیار کئے۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے الفاظ اس چیز کے غماز ہیں کہ ابتدائی سالوں میں ہندوستانیوں کے مذہب کی تبدیلی انگریز حکمرانوں کی شعوری کوشش رہی ہے، وہ رقمطراز ہے، '' یہاں میں اپنے آپ کو اس چیز کی اجازت نہیں دیتا کہ میں ان ذرائع کا ذکر کروں جن سے ہندو اور مسلمان یکساں طور پر (اپنے اپنے مذہب سے) بے اعتنائی برتنے کے بعد عقیدے کی اعلیٰ سطح (عیسائیت) تک پہنچ سکتے ہیں۔ مگر مجھے اس کا پکا یقین ہے کہ وہ دن ضرور آئے گا اور یہ کہ ہمارا نظامِ تعلیم، جو اب تک منفی قدریں پیدا کرتا رہا ہے، اس مقصد کی طرف پہلا قدم ہے۔ اب تک ہندوستان میں انگریزوں کی پیش قدمی بہت حقیر رہی ہے''۔ اشتیاق حسین قریشی، حوالہ سابقہ، ص ۲۸۹۔

۷۔ روزنامہ جنگ لاہور، ۱۵اکتوبر، ۲۰۰۱۔
۸۔ ہمارے پیش نظر وہ روایت ہے کہ طلب العلم فریضة علی کل مسلم.
۹۔ مسلمانوں کی علوم میں ترقی کسی تحریک کی بدولت نہ تھی بلکہ مسلم حکومتوں کے سیاسی عروج کے باعث انہیں وہ مواقع میسر آئے جو علوم کی ترقی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے سیاسی طاقت کے زوال کے ساتھ ان کی علوم میں دلچسپی کا سورج بھی غروب ہوگیا۔
۱۰۔ مذہبی اور علمی فکر میں فرق پایا جاتا ہے۔ مذہبی فکر کا سارا زور اپنے مسلک کے صحیح غلط مسائل کو ثابت کرنے پر ہوتا ہے جب کہ علمی کاوش اپنے اندر غیر جانبدارانہ رجحان رکھتی ہے۔ یہ احتیاط رہے کہ مذہبی سوچ کو اسلامی فکر سے خلط نہیں کرنا چاہئیے کیونکہ اسلام مذہب سے زیادہ وسیع معنی رکھتا ہے۔
۱۱۔ سیدمناظر احسن گیلانی، *امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی* (کراچی:نفیس اکیڈمی، ۱۹۴۹ء)ص۔۱۳۷
۱۲۔ ایضاً۔
۱۳۔ دی انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ، جلد۳(لائیڈن : ای۔ جے۔ برل، ۱۹۸۳)ص۔۱۱۶۶، زیدیہ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے :

Supporters of the revolt of Zayd bin Ali.

۱۴۔ شبلی نعمانی، *سیرت النعمان* (لاہور : ایم ثناء اللہ خان، سن ندارد)ص۔ ۱۳۰
۱۵۔ اشتیاق حسین قریشی، حوالہ سابقہ، ص۲۳۶۔جب علمائے متقدمین نے چار دبستان ہائے فقہ کو بہ حیثیت مساوی راسخ الاعتقاد تسلیم کرلیا تو اس کے یہ معنی تھے کہ انہوں نے بن کہے یہ بھی تسلیم کرلیا کہ مقدس آیات قرآنی کی تفسیر میں اختلافِ آراء کی گنجائش موجود ہے۔ مگر علمائے متاخرین کے فکر میں کافی شدت پیدا ہوگئی۔
۱۶۔ ایضاً، ص۲۳۷۔سنیوں کی مروجہ رائے یہ تھی کہ بعد کے زمانہ کا اجتہاد چار مسلمہ دبستانوں کی چار دیواری سے باہر نہیں جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ ایک دبستان کے پیروؤں کو دوسرے دبستان کے فتاوٰی سے اخذ نہیں کرنا چاہیے۔
۱۷۔ ان حضرات کے سیاسی نظریات کے ملاحظہ ہو،*قرونِ وسطٰی کے مسلمانوں کے سیاسی نظریے* (لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۵۸)
۱۸۔ اشتیاق حسین قریشی، حوالہ سابقہ، ص ۱۶۵۔ دگر اعتقادی (Heterodoxy) کے متعلق بحث کا ایک نکتہ۔
۱۹۔ ڈاکٹر مبارک علی، *المیہ تاریخ* (لاہور:پروگریسو پبلشرز، ۱۹۹۳)ص۴۹تا ۶۱۔فاضل مصنف نے اپنی کتاب میں 'تصوف کی روحانی سلطنت' کے باب کے تحت مدلل بحث کی ہے کہ کس طرح سے ہر سلسلہ کے مرید اپنی اپنی خانقاہوں سے چمٹے اپنے شیخ کے تصور میں زندگیاں بسر کررہے تھے اور کس طرح سے ان کا دربار، ایک دنیاوی دربار سے مماثلت رکھتا تھا۔
۲۰۔ اشتیاق حسین قریشی، *دی ایڈمنسٹریشن آف دی مغل ایمپائر* (کراچی :کراچی یونیورسٹی، ۱۹۶۶)ص ۳۲۔اکبر نے جو دینی اور دنیاوی معاملات کو ایک محضر کے ذریعے اپنے ہاتھ میں لے لیا تو یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔اس حوالے سے آئی ایچ قریشی رقم طراز ہیں۔

There was nothing revolutionary in this principle, because it had always been accepted.

۲۱۔ عباسیوں نے مملکت اسلامیہ پر اپنی خلافت کو ضعیف روایتوں کے ذریعے اس حد تک پھیلایا کہ ہندوستان کے دور دراز ملک میں عباسی خلافت کے خاتمے کے چالیس سال بعد تک سکے اور خطبوں میں اسی کا نام رہا۔ ملاحظہ کیجئے، قریشی، *سلطنت دہلی کا نظم حکومت*، (کراچی : کراچی یونیورسٹی، ۱۹۶۴)ص۔۲۹۔

۲۲۔ سید سلیمان ندوی، *عرب و ہند کے تعلقات* (کراچی : اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷)ص۔۲۴۳۔

۲۳۔ اشتیاق حسین قریشی، برعظیم پاک و ہند کی ملت ِ اسلامیہ، ص۲۳۔

۲۴۔ سید سلیمان ندوی ، حوالہ سابقہ، ص۔۳۰۴۔

۲۵۔ صباح الدین عبدالرحمٰن، عہد مغلیہ۔ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں ، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۲)ص۔۶۴۔

۲۶۔ ایضاً، ص۔ ۳۳۲۔

۲۷۔ ڈاکٹر مبارک علی، حوالہ سابقہ، ص۔۱۱۔

۲۸۔ لارڈ نارتھ بور، *ریلیجن ان دی ماڈرن ورلڈ*(لاہور: سہیل اکیڈمی، ۱۹۹۹)ص۱۔مصنف کے کمیونزم کے بارے میں الفاظ ہماری تائید کرتے ہیں کہ۔

Even Communism is sometimes loosely called a religion, regardless of its origin and tendencies, and of the fact it is no more than a construction of the mind.

۲۹۔ سید سلیمان ندوی، *سیرت النبیﷺ*، جلد چہارم(لاہور:الفیصل ناشران و تاجران کتب ، ۱۹۹۱ء)ص۔۴۱۵، بحوالہ بخاری۔

۳۰۔ سید سلیمان ندوی، خطبات ِ مدراس (لاہور : ادار ہ اسلامیات، ۱۹۸۳)فاضل مصنف نے ان خطبات میں شرح و بسط کے ساتھ تاریخیت، جامعیت اور عملیت کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ کس طرح سے آج صرف محمدﷺ کی زندگی ہی ان تمام حوالوں سے اپنانے کے قابل ہے۔ ۔

۳۱۔ امام نووی، *شرح صحیح مسلم* (لاہور : نعمانی کتب خانہ ، ۱۹۸۱)ص۔۲۲۳۔

۳۲۔ ایضاً، ص۔ ۲۲۶۔

۳۳۔ حافظ صلاح الدین یوسف، *دلیل الطالبین*، ترجمہ و فوائد *ریاض الصالحین* از ابو زکریا یحیٰی بن اشرف النووی (لاہور: دارالسلام، ۱۹۹۷)ص۔۵۴۳۔

۳۴۔ ابن کثیر، *البدایۃ والنہایۃ* مترجم :فتح اللہ مرادآبادی (کراچی : نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۹ء)ص۱۰۳۴۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے وقتِ خروج حضرت حسینؓ کو یہ کہہ کر روکنے کی کوشش کی تھی کہ رسولﷺ کو اللہ نے اختیار دیا دنیا اور آخرت میں، تو آپﷺ نے آخرت کو پسند فرمایا، لہٰذا آپ ان کی پیروی کیجئے اور خروج کی راہ کو ترک کردیجئے۔

۳۵۔ حافظ صلاح الدین یوسف، *دلیل الطالبین*، ص۔۵۴۰۔

۳۶۔ ایضاً۔

۳۷۔ ایضاً، ص۔۵۴۱۔

۳۸۔ شبلی نعمانی، *سیرت النبیﷺ*، جلد دوم(لاہور:الفیصل ناشران و تاجران کتب ، ۱۹۹۱ء) ص۔ ۲۰۱۔

۳۹۔ ایضاً، بحوالہ بخاری۔

۴۰۔ ایضاً، جلداول، ص۔ ۲۳۰۔

۴۱۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ کا ''عہد نبوی میں نظام تعلیم ''پر لیکچر، *مجلّہ علم القرآن*، کراچی، پارہ ۲۰، دسمبر ۱۹۹۱ء، ص۔۲۲۳۵۔

۴۲۔ ایضاً، ص۔۲۲۳۶۔

۴۳۔ ایضاً، ص۔۲۲۳۵۔

۴۴۔ شبلی نعمانی، *سیرت النبیﷺ*، جلد دوم، ص۔۲۰۱۔

۴۵۔ ایضاً۔

ادارہ ھذا کی نئی اشاعت

کتاب سے متعلق

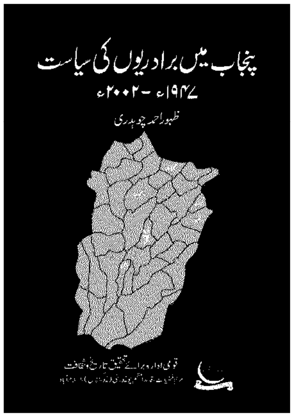

پنجاب کے لوک معاشرے میں جہاں زراعت ہمیشہ سے معیشت کا ایک لازمہ رہی ہے وہاں ذات برادریوں کا وجود اور ان کی اہمیت بھی ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ ذات برادری نے پنجابیوں کے طرزِ معاشرت، خانگی زندگی، رسوم و رواج، ثقافت اور سیاست پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں کیونکہ پنجاب کا ہر ایک باشندہ ان سماجی اداروں سے منسلک ہے۔ اکثر اوقات پنجابی سماج میں یہ تعلق بزعمِ خود، اعلیٰ ذات سے ہونے کی وجہ سے احساسِ برتری یا نسلی تفاخر جبکہ نچلی ذاتوں یا پیشوں کے افراد کے لئے ندامت اور احساسِ کمتری پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔

زیرِ نظر تحقیق میں برادریوں کے تاریخی اور سماجی پس منظر، پنجابی معاشرے میں اُن کے مقام اور کردار نیز بلدیاتی انتخابات سے لے کر قومی اور صوبائی انتخابات میں اُن کے فعال کردار کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح ملکی سیاسی جماعتوں کے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مضبوط برادریوں کے ہاتھوں بلیک میل ہونے اور حالیہ دور میں ہونے والی شہرکاری (Urbanization) اور صنعت افروزی (Industrialization) جیسی تبدیلیوں کے پیشِ نظر برادریوں کے سیاسی کردار اور اجارہ داری میں متوقع تبدیلی بھی اس بحث کا حصہ ہے۔

بذریعہ ڈاک منگوانے کیلئے رابطہ کریں

ناشر: قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت،

مرکزِ فضیلت، قائدِاعظم یونیورسٹی (نیو کیمپس) شاہدرہ روڈ، اسلام آباد

فون نمبرز: 051-2896151, 2896153-4/141

ای میل: nihcr@hotmail.com ویب سائٹ: www.nihcr.edu.pk